سلیم عباس
لیکچرار اردو، آرمی پبلک ڈگری کالج، ملیر کینٹ، کراچی

بیسویں صدی کے فکری رجحانات کے تناظر میں جوشؔ ملیح آبادی کے افکار کا تنقیدی مطالعہ

Abstracts

A critical study of Josh Malihabadi's thoughts in the context of twentieth century intellectual trends

By Saleem Abbas, Lecturer Urdu, Army Public Degree College, Malir Cantt., Karachi

While the twentieth century is a century of great importance in the global context, it is also very important from the point of view of the political, economic, literary and intellectual situation of the Indian subcontinent. Where the political and intellectual situation of this century affected other areas of life, it also completely changed the literary landscape of that period. And in this century, including **Allama Iqbal**, **Faiz Ahmed Faiz** and many other great poets of Urdu, intellectual poets like **Josh Malihabadi** could not live without being affected by this situation. Through his sublime poetry and his universal thoughts, he played an important role in defining the intellectual and political destiny of the revolutionary and enlightened minds of the twentieth century and the new generations of twentieth century India. And **Josh Malihabadi** has not only influenced the people of the twentieth century through his high harmonious poetry and diverse thoughts, but even today in the twenty 1st

century, rationalist and enlightened people are guided by his poetry and thoughts.

Keywords: Josh Malihabadi twentieth century, political situation, intellectual situation, literary landscape, revolutionary

کلیدی الفاظ: جوشؔ ملیح آبادی، بیسویں صدی، سیاسی صورتحال، فکری تناظر، ادبی منظر نامہ، انقلاب، تصور انقلاب

شاعرِ انقلاب، شاعرِ شباب، پیغمبرِ فطرت، مفکر العصر، شاعرِ آخر الزماں، شبیر حسن خان جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۴ء-۱۹۸۲ء) بیسویں صدی عیسوی کے شعرا میں اپنی خلّاقانہ صلاحیتوں اور شاعری کے متنوع موضوعات کے اعتبار سے منفرد مقام و مرتبے کے حامل شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا زمانہ کئی نسلوں پر محیط ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں زندگی کے متنوع تجربات کا عکس ملتا ہے۔ کسی بھی شاعر کی شاعری، افکار اور نظریات کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اس شاعر کی شخصی زندگی کے تاثرات اور اس کے عہد کی اجتماعی زندگی کی تحریکات دونوں اہم ہوتے ہیں، جبکہ جوشؔ کی شاعری کا سفر بیسویں صدی کے سیاسی اور فکری ارتقا اور متحدہ ہندوستان کے تہذیبی عروج و زوال کی داستان ہے۔ اس لیے جوشؔ کی شاعری اور ان کے افکار کو سمجھنے کے لیے جوشؔ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے مجموعی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی حالات کا مختصر جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

بیسویں صدی جہاں عالمی انقلابات، ایجادات، سیاست، سائنس، سماج اور ادب غرضے کہ زندگی کے ہر شعبے کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل صدی ہے، خصوصیت کے ساتھ برصغیر کے تناظر میں اس دور کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا اس عہد کے ادبی رجحانات اور اس دور کے حوالے سے جوشؔ کی فکر، تصورات، نظریے اور شاعری پر بات کرنے سے پہلے اس عہد کے سیاسی، اور سماجی منظر نامے کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم ذیل میں بیسویں صدی کے سیاسی اور تہذیبی منظر نامے کا مختصر خلاصہ پیش کریں گے، تاکہ بیسویں صدی کے تناظر میں جوشؔ کے افکار اور شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

زندگی کے کسی بھی شعبے کے حوالے سے نئے رجحانات اچانک معرض وجود میں نہیں آتے بلکہ ان کی تخلیق کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ جب ہم بیسویں صدی کے سیاسی منظر نامے کے محرکات پر نظر ڈالتے ہیں تو ۱۸۵۷ء کا سال ایک سنگِ میل بن کر سامنے آتا ہے۔ یوں تو ہندوستان پر انگریز کافی عرصہ پہلے سے ہی قابض تھے

اور پورے برصغیر میں انھیں کے اقتدار کا سکہ چل رہا تھا اور اس برطانوی اقتدار کے خلاف وقتاً فوقتاً چھوٹی موٹی بغاوتیں بھی سر اٹھاتی رہتی تھی۔ لیکن اس دفعہ پورے ملک میں بغاوت کی تحریک زور پکڑتی گئی اور انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی طرف سے شدید مزاحمت کی گئی۔ لیکن یہ بغاوت کامیاب نہیں ہو سکی، اس بغاوت کو انگریزوں نے بے دردی کے ساتھ کچل دیا۔ اس ناکام جنگ کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں، بالخصوص مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرا کر ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔

اس صورتحال کی تفصیل میں جانے کے بجائے ان حالات میں پیدا ہونے والے رجحانات کا نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ناکام تحریک بادی النظر میں وہ نقطہ تھا جہاں سے انگریزوں کی حکمتِ عملی کو پورے طور پر کامیابی ملی لیکن درصل دیکھا جائے تو یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جہاں سے ہندوستان بیدار ہونے لگا۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہندوستانی بالخصوص مسلمان شدید کشمکش کا شکار رہے۔ غدر سے پہلے یہ خیالات عام تھے کہ حکومت واپس مسلمان کے ہاتھ میں آئے گی لیکن غدر کے بعد یہ امید مایوسی میں تبدیل ہوتی گئی۔

انیسویں صدی کے آغاز سے ہی لسانی طور پر ہندوستانیوں کی اکثریت انگریزی سے متاثر نظر آرہی تھی جس میں فورٹ ولیم کالج کے اثرات بھی کافی نمایاں تھے اور میر امنؔ کی باغ و بہار اور غالبؔ کے خطوط کی اشاعت سے اُردو نثر کو بھی نیا موڑ ملا تھا، اس لسانی جھکاؤ اور پھر جنگِ آزادی کے بعد کی سیاسی صورت حال کے زیرِ اثر علی گڑھ تحریک شروع ہوئی اور سرسیدؔ اور ان کے ساتھیوں نے پہلی بار عقلیت پسندی اور مقصدیت پر زور دیا اور نثر میں انگریزی علم و فن کا عقلیت پسند رجحان سامنے لایا جبکہ جدید اُردو نثر کے ساتھ ساتھ حالیؔ کی نظم نگاری کا شہرہ بھی عام ہونے لگا۔

دوسری طرف محمد حسین آزادؔ کی قیادت میں انجمنِ پنجاب کے تحت شاعری کے نئے تجربات شروع ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ غزل سے انحراف کرتے ہوئے نظمیں لکھنے پر زیادہ زور دیا گیا، تصوراتی شاعری کے بجائے شاعری کو معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور شاعری میں تصنع کے بجائے سادگی اور اصلیت کو ترجیح دی گئی جبکہ شاعری میں نئے تجربات کے علاوہ حالیؔ کے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' اور شبلیؔ کے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' کے ساتھ اُردو تنقید کا باقاعدہ آغاز بھی ہوا اور غزل سے زیادہ نظم اور نثر کی اہمیت پر بات کی گئی۔

جب ہم بیسویں صدی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کا نصفِ اول انیسویں صدی کے نصف آخر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ پوری دنیا، بالخصوص برصغیر میں بدامنی اور انتشار کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ ملک کی آزادی کی جنگ جاری ہی تھی کہ پہلی جنگ عظیم کا بھی آغاز ہو گیا جس نے انسانی اقدار کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور اس جنگِ عظیم نے ہندوستان کو بھی گھیر لیا۔ انگریزوں نے ہندوستانی فوجوں کو جبراً عالمی محاذوں

پر لڑنے کے لیے بھیجا جس سے ہندوستانی عوام میں مزید بے چینی پھیل گئی۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی نظام کا انقلاب آیا اس انقلاب کا اثر ہندوستانیوں پر بھی ہوا۔ ادھر انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پاس کیا جس کے تحت حکومت جب چاہے کسی کو بھی کسی مقدمے کے بغیر جیل میں بند کر سکتی تھی۔ اس ظالمانہ قانون کے خلاف ملک گیر احتجاج ہوا اور ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو قومی اہانت کا دن منایا گیا جبکہ اس کے فوراً بعد ۱۳ر اپریل کو جلیاں باغ والا اندوہناک سانحہ رونما ہوا جس میں دس منٹ میں ہزاروں کی تعداد میں بے گناہ ہندوستانیوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ تحریکِ خلافت وجود میں آئی جس کی کانگریس نے بھی حمایت کی اس تحریک کی قیادت علی برادران کر رہے تھے اورر بہت جلد گاندھیؔ بھی اس کارواں کا حصہ بنے اور آہستہ آہستہ اس نے ملک گیر تحریک کا روپ دھار لیا۔ ۱۹۲۲ء میں چوراچوری کے مقام پر گاؤں والوں نے پولیس سٹیشن کو نذر آتش کیا جس میں کچھ پولیس اہلکار جاں بحق ہوئے اس واقعے سے خفا ہو کر گاندھیؔ تحریک سے دست بردار ہوئے اور ۱۹۲۳ء کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔

اس تمام تر صورتحال کے پیش نظر بیسویں صدی کے آغاز میں تحریکِ آزادی کی شدت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اسی کے ساتھ ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ ادھر عالمی سطح پر سیاسی صورتحال نے کروٹ بدلی۔ ہٹلرؔ کی قیادت میں ۱۹۳۳ء میں فاشیزم نے اپنا قدم جمالیا جس نے وقت کے ساتھ ساتھ پورے یورپ کو سیاسی بحران میں مبتلا کر دیا اور اسی کے ساتھ ہی ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز بھی ہوا جس نے ایک کروڑ کے قریب انسانوں کو لقمۂ اجل بنایا۔ ادھر جاپانیوں نے ملک کے مشرقی حصے پر حملہ کر کے ہندوستان کو بھی جنگ کی آگ میں جھونک دیا، جس میں متعدد ہندوستانیوں کا جانی نقصان بھی ہوا۔ اسی دوران ۱۹۴۳ء میں قحط نے بنگال کو آن گھیرا جس نے لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانیوں کی جانیں لیں جس کے نتیجے میں سرمایہ داری اور بھوک نے جنم لیا۔ ان حالات میں تخلیق پانے والا ادب کس قسم کا ہو گا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

سیاسی اور سماجی پس منظر سے قطع نظر صرف ادبی نقطہ نگاہ سے جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں غالبؔ کی منفرد شاعرانہ شان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، لیکن اسی کے ساتھ غزل کے خلاف حالیؔ کا مقدمہ شعر و شاعری بڑی آب و تاب کے ساتھ سامنے آیا اور بڑی حد تک اُردو غزل کی عام روایت سے انحراف کا رویہ پیدا ہوا۔ اُردو شاعری میں نظمیں شروع ہی سے کہی جاتی تھیں لیکن اُردو نظم کو جو شناخت حالیؔ کے عہد میں ملی وہ اس سے پہلے کی نظم میں نظر نہیں آتی۔ اس عہد میں اُردو نظم نگاری پر جو زور دیا گیا اس کا سبب اُردو شعرا و ادبا کا سماجی شعور تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ اس عہد میں نظموں کے ذریعے جن موضوعات کو اجاگر کیا گیا وہ موضوعات روایتی نظم نگاری کا فی البدیہہ شعور کے برعکس ایک منظم اسکیم کے تحت سیاسی اور سماجی صورتحال کے

پس منظر میں مقصدیت کو سامنے رکھتے ہوئے منتخب کیے گئے۔ جبکہ حالیؔ اور ان کے رفقاء کی تحریک کے بعد اُردو نظم نگاری کا باقاعدہ مقصد متعین ہو گیا۔ جدید دور کی جدید فکر بالخصوص مقدمہ شعر و شاعری کے زیرِ اثر اس عہد کے شعرا نے اُردو کی اہم اصناف نظم اور غزل دونوں کو بامقصد بنانے کی سعی کی یہی وجہ ہے کہ جہاں اقبالؔ کی نظموں نے ہندوستانیوں کے سیاسی ذہن کو متاثر کیا وہاں غزل میں داغؔ دہلوی کی شاعری کو بھی شہرتِ عام حاصل ہوئی۔

بیسویں صدی کے اس ابتدائی دور میں رومانی تحریک بھی سامنے آگئی جو ایک طرف سر سیدؔ کی تحریک کا رد عمل تھی اور دوسری طرف ایک نئی دنیا کا کھوج لگانے پر مائل تھی۔ سجاد حیدر یلدرمؔ اور نیازؔ فتح پوری جیسی شخصیات اس تحریک کے علمبر دار تھے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر آنے والے ادبا اور شعرا کے اندر ایک جہانِ نو کی تلاش کا جذبہ موجود تھا۔ گویا رومانوی تحریک اپنے ماحول سے برگشتہ اور ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی آرزو مند تھی۔ ویسے بھی اس دور کا ہندوستان سیاسی سطح پر بیدار ہو رہا تھا اور اس بیداری کے سبب عوام میں جذباتی ردِ عمل پیدا ہونے لگا تھا، اس تحریک سے متاثر شعرا و ادبا حقیقت پسندی کے رجحان کو ترک کر کے ایک ایسے جہان کے باسی بننے کی کوشش کر رہے تھے جو ابھی معرض وجود ہی میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اسی دور میں اقبالؔ نے فرد کو احمقوں کی جنت سے نکالنے اور ایک نئی فکر سے روشناس کرنے کی کوشش کی۔ اقبالؔ کی یہ فکر نہ تو مغرب سے مرعوب فکر تھی اور نہ ہی قدیم روایت کی طرف مائل فکر تھی اور نہ ہی اس کی اساس خیالی دنیا پر استوار تھی اس لیے اقبالؔ کی تحریک کو اُردو ادب میں منفرد مقام حاصل ہوا۔ اقبالؔ نے سر سیدؔ اور حالیؔ کے برعکس مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھا تھا اور اس تہذیب کی عمارت کو لرزتے ہوئے اور ٹوٹتے ہوئے دیکھا تھا جس نے اقبالؔ کے اندر نظریاتی خود اعتمادی پیدا کر دی اس لیے وہ مغرب کی عام روش سے ہٹ کر اپنے لیے الگ راستہ بنانے پر مائل ہوئے۔ اقبالؔ کے اس نئے فکری اسلوب میں جو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ انھوں نے محنت کی ضرورت پر زور دیا، دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے عروج کے دور کی مثالیں پیش کیں اور تیسرا اہم نکتہ یہ کہ انھوں نے اپنی فکر کے اظہار کے لیے بلند آہنگ لہجہ اختیار کیا۔ اقبالؔ نے اُردو ادب کو بازاری فضا سے نجات دلا کر اس میں فکری گہرائی پیدا کر دی اور ادب کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ گویا اقبالؔ کی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی فکری پھیلاؤ تھی اور دراصل اسی ایک عنصر نے اقبالؔ کے بعد ابھرنے والی تحریکوں اور رجحانات کو متعدد نئی سمتوں سے روشناس کیا۔

اس دور کے ادبی شعور کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ کسی بھی ہمہ گیر نظریے کی عدم موجودگی کے باوجود اس نے نفسیاتی طور پر لوگوں کی ذہنی سطح کو حقیقت پسندی کی طرف راغب کیا۔ اس دور میں حب الوطنی پر زور دیا گیا، اتفاق و اتحاد کی باتیں کی گئیں اپنے ملک سے محبت سکھائی گئی اور اس طرح کمتری کا احساس ختم کرنے کی سعی کی گئی۔

جبکہ دوسری طرف اسی دور میں جرمنی میں ہٹلرؔ نے اپنے ملک کے شعرا اور ادیبوں کو جلاوطن اور قید کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان واقعات نے عالمی سطح پر تمام شعرا، ادبا اور جمہوریت پسندوں کو ایک نقطے پر لا کر جمع کر دیا تھا۔ اس عالمی سیاسی منظر نامے اور ادب میں جدید رجحانات کی ترویج کی اہمیت کے پیشِ نظر ہندوستان کے چند طلبا، جن میں سجاد ظہیرؔ کا نام سر فہرست ہے، نے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور اس انجمن کے منشور کا مسودہ تیار کر کے ہندوستان بھیج دیا گیا اور ہندوستان کے ادبا اور شعرا سے رائے لی گئی۔ اس منشور کو ہندوستان میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی دوران سجاد ظہیرؔ ہندوستان واپس آ گئے اور ہندوستان کے ادبا اور شعرا بالخصوص پریمؔ چند، مولوی عبدالحقؔ اور جوشؔ ملیح آبادی سے ملاقاتیں کیں اور انجمن کے منشور سے آگاہ کیا جس سے ان تینوں ادیبوں نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ مسودے پر دستخط بھی کیے اور رفتہ رفتہ بہت سے ہندوستانی ادیبوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوئے جن میں، حسرتؔ موہانی، نیازؔ فتح پوری اور فراقؔ گورکھ پوری جیسی اہم شخصیات بھی شامل تھیں۔ اس تحریک کے نظریے کے مطابق ادب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی منزل کی طرف لے جائیں, ان جذبات کو رد کرے جو دنیا کو آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے دھکیل دیں اور ایسا اندازِ بیاں اختیار کرنا چاہیے کہ جو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں کیوں کہ زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا بھلا ہو سکے۔ اس جیسے ترقی پسند نظریوں سے اس دور کی فکری تبدیلیوں اور نئے ادبی رجحانات کا اندازہ بہ خوبی ہوتا ہے۔

ہندوستان کا یہ سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب جوشؔ نے ۱۸۹۴ء میں آنکھیں کھولیں تو انگریزوں کے زیرِ سایہ ہندوستان کا یہ افراتفری پر مبنی سفر جاری تھا اور ہندوستانیوں کے دل میں روز بہ روز انگریز مخالف جذبات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، متحدہ ہندوستانی قوم کے دو بنیادی فرقے یعنی ہندو اور مسلمان کبھی ساتھ ساتھ اور کبھی الگ ہو کر اپنے اجتماعی حقوق کے حصول کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں نئے زاویوں پر ہندوستانیوں کی ذہنی تشکیل ہو رہی تھی کہ اسی اثنا میں روس اور جاپان کی جنگ کا آغاز ہوا اور اس تصادم کے زیرِ اثر بھی ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مشرق کی ایک چھوٹی سی قوم یعنی جاپانی جب روس جیسی عظیم قوم کے ساتھ ٹکرائی اور فتح یاب ہوئی تو اس کا زبردست اثر ایشائی قوموں بالخصوص ہندوستانیوں پر بھی ہوا۔ جوشؔ کے فکر و فن کی تعمیر و تشکیل میں اس سماجی، سیاسی اور فکری صورتحال کے اثرات گہرے نظر آتے ہیں اس لیے بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر حصولِ آزادی اور آزادی کے بعد تک جوشؔ کے افکار میں اس دور کے حالات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

اپنی شاعری کے آغاز میں جوشؔ نے سیاسی صورتحال پر کچھ خاص توجہ نہیں دی لیکن ۱۹۲۴ء کے بعد ان کی

شاعری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۹۲۵ء کے بعد سے ۱۹۴۵ء تک جوشؔ نے آزادی اور ترقی پسند تحریک کا سپاہی بن کر مادرِ وطن کی خدمت جاری رکھی۔ انگریز سامراج کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعے آواز بلند کرتے رہے۔ بالخصوص "ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب" جیسی خطرناک نظم لکھ کر آزادی کے متوالوں میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ یہ نظم پہلی بار "نیا ادب" میں شائع ہوئی۔ اس نظم نے پورے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا اور اس کی ہزاروں کاپیاں ہاتھ سے لکھ لکھ کر پورے ہندوستان میں پھیلا دی گئیں۔ انھیں دنوں جوشؔ کے گھر کی تلاشی لی گئی جس پر انھوں نے "تلاشی" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ المختصر جوشؔ اس طرح کی متعدد نظمیں وقتاً فوقتاً کہتے رہے اور ہندوستان کی آزادی تک مسلسل ہندوستانیوں کے اندر آزادی اور حُرّیت کا جذبہ پیدا کرتے رہے۔

سیاسی، سماجی، اور معاشی نقطۂ نظر سے جو ناگفتہ بہ صورتِ حال بیسویں صدی کے نصفِ اول میں تھی، ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی یہی صورت حال رہی تقسیم کے دوران اور تقسیم کے فوراً بعد متعدد مسائل نے جنم لیا۔ ان مسائل میں سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ مذہب اور وطن کے نام پر قتل وغارت اور فسادات تھے جو ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان ہوئے۔ ان فسادات نے ۱۹۴۷ء میں ایسی بھیانک شکل اختیار کی کہ پاکستان اور ہندوستان میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ دوسرا اہم مسئلہ ریاست سے وفاداری کا مسئلہ تھا جس کا چرچہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں ہوا جبکہ ادبی نقطۂ نگاہ سے تیسرا اور سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا، چوں کہ ترقی پسند تحریک کسی خاص زبان کے حوالے سے مخصوص نہیں تھی بلکہ یہ تحریک ملک کی سبھی زبانوں کی تحریک تھی لیکن جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اور پاکستان کی قومی زبان "اُردو" اور ہندوستان کی "ہندی" بن گئی تو نئے سرے سے اُردو ہندی تنازعے کو پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی، جس کے سبب ہندوستان کے اُردو ادیب نئے اور قدرے زیادہ پریشان کن حالات سے دوچار ہو گئے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد والے دور کی شاعری کا نمایاں اور بنیادی موضوع یہی فسادات رہے۔ اس دور کی نظموں میں اس درندگی اور بربریت کی مذمت کی گئی جس کا مظاہرہ اس زمانے کے ہولناک فسادات میں ہو رہا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ کوریا، ویتنام، الجزائر اور افریقہ کی جنگ آزادی اور عرب اسرائیل جنگ بھی پاکستانی نظموں کا موضوع بنی ان موضوعات پر ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں قسم کے شعرا نظمیں تخلیق کرتے رہے اور یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک جاری رہا۔

تقسیم کے بعد ہندوستان میں جو قتل وغارت گری ہوئی اس نے جوشؔ کو بہت تکلیف پہنچائی۔ جب جوشؔ کو مجبوری کے تحت اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ پاکستان چلے آئے تو ان کی وطن پرستی اور وطن کی محبت پر الزام لگائے گئے مگر ان کے اس فیصلے میں مستقبل کے تحفظ کا خیال مضمر تھا۔

جوشؔ کی فکر کا محور انسان تھا، انسان ہندوستان میں بھی تھا اور پاکستان میں بھی، ملک کی سرحدیں بدلنے سے انسانی مسائل تبدیل نہیں ہوتے۔ انسان دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو اس کی بے قراری اور ناآسودگی برقرار رہتی ہے۔ اسی وجہ سے جوشؔ کی شاعری میں وہ بے قراری اور کسک ہر جگہ اور ہر لمحہ نظر آتی ہے۔ لہٰذا جس طرح جوشؔ ہندوستان میں اپنی فکر کی شمعیں جلا رہے تھے اسی طرح پاکستان کے نئے ماحول میں بھی اپنی فکر اور شاعری سے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرتے رہے۔ اور یہ کوشش تادمِ آخر جاری رکھی۔

جوشؔ کا پیغام اور فلسفۂ حیات:

کسی شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے توجہ کا اصل مرکز شاعر کی ذات کو ہونا چاہیے یا اس کی شاعری کو؟ یہ سوال مختلف صورتوں میں نقادوں میں زیرِ بحث رہا ہے۔ پھر شاعری میں بھی کسی نے مواد اور موضوع کو زیادہ اہمیت دی ہے تو کسی نے ہئیت، انداز اور زبان و بیان کو، یہاں اس بحث کو اصولی حیثیت سے پیش کرنا ضروری نہیں صرف اتنا جاننا ضروری ہے کہ جوشؔ کی شاعری اور ان کے افکار کے مطالعے کے وقت ان تینوں باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہو گا۔

بعض ناقدین کے نزدیک جوشؔ کی فکر میں کوئی باضابطہ نظامِ حیات یا کوئی مربوط اور منظم پیغام یا پھر زندگی کے لیے کوئی خاص منظم سیاسی و اقتصادی نظام نہیں۔ یہ اعتراضات دیکھ کر لگتا ہے کہ دراصل یہ لوگ جوشؔ کو رفارمر یا نجات دہندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ معترضین اسے جوشؔ کی فکر کا نقص سمجھتے ہیں۔ اصل میں ان کے اپنے اصولوں کے مطابق شاعری ریل کی پٹڑی کی طرح ایک متعین راستے پر چلنے کا نام ہے حالانکہ جب جوشؔ کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی لامتناہی قوتِ متخیلہ کی تیز کاٹ اور تعجب خیز قادر الکلامی کے ذریعے زندگی کی ایسی ایسی تصویریں بناتے ہیں کہ زندگی کی یہی رنگارنگ تصویریں ان کی شاعری کا پیغام بن جاتی ہیں۔

ایک مفکر اور مفکر شاعر میں فرق ہوتا ہے۔ مفکر شاعر کو صرف فلسفیانہ افکار میں نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے اپنی فکر کو فن میں کس سلیقے سے برتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی فکر کو اپنے خون جگر کی آمیزش سے احساس بنا سکا ہے یا نہیں۔ اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم بیسویں صدی کے شعرا پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبالؔ کے بعد کوئی ایسا شاعر نظر آتا ہے تو وہ جوشؔ ملیح آبادی ہے۔ جوشؔ ان اہلِ قلم میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کی نئی تفسیر لکھی ہے اور اپنی تاویلاتِ حیات کے ذریعے سے اپنا نیا معیار قائم کیا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے دانشوروں، فلسفیوں، اور رہنماؤں کی ریاضت سے زیادہ اپنی شاعرانہ بصیرت پر اعتماد کرتے ہیں۔

جوشؔ کے کلام کے مطالعے سے پہلے صرف ان کے مجموعہ ہائے کلام کے ناموں پر نظر ڈالنے سے ہی فکر کا

ایک جہان دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام سموم وصبا، سنبل وسلاسل، عرش وفرش، الہام وفکار اور شعلہ و شبنم وغیرہ جیسے عنوانات سے ظاہری طور پر یہ نظر آتا ہے کہ جوشؔ کی نظر زندگی اور کائنات کے متضاد پہلوؤں پر ہے، لیکن حقیقت میں ظاہری طور پر متضاد نظر آنے والے پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انھیں کی بدولت زندگی یا کائنات ایک اکائی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یعنی سیف وسبو، سنبل وسلاسل یا جنون وحکمت ایک دوسرے کے مخالف پہلو نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ جوشؔ حیات وکائنات کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ اس ارتقا کے سلسلے کو ایک اکائی کی طرح دیکھتے ہیں۔ بطورِ مفکر شاعر جوشؔ کی نظر میں حیات وکائنات کے مختلف پہلو متضاد کیفیت کے حامل نہیں ہیں بلکہ جوشؔ انھیں ایک دوسرے کی تعمیر وتکمیل کے لیے لازمی عناصر سمجھتے ہیں۔ اور ان کی فکر و نظر کی بنیاد بھی اسی پر رکھتے ہیں۔ گویا جوشؔ کی نگاہ مکمل نظامِ کائنات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ نقطہ نگاہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور قاری کو کسی بھی سوچنے والے کے دل ودماغ کی تعمیر وارتقا کے مفہوم سے آگاہ کرتا ہے۔

جوشؔ کی شاعری کا فکری پہلو:

کسی بھی شاعر کے امتیازی پہلوؤں اور لب ولہجے کے مطالعے کے لیے اس کی ذہنی کیفیات، نفسیاتی محرکات اور شخصیت کے تجزیے کے ساتھ ساتھ اس کے معاشرتی روابط پر بھی غور کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ چناں چہ جس قدر اس کی داخلی زندگی خارجی زندگی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اسی قدر اس کے فن میں زندگی کے حقائق کی واضح شکل سامنے آتی ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں جوشؔ بھی ان شاعروں کی صف میں سب سے آگے نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے باطن کو معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کر کے فنی بصیرت اور عظمت کا بلند معیار پیش کیا ہے۔

جوشؔ کا تعلق افغانی نسل سے تھا اور اس پر خود جوشؔ کو فخر بھی تھا چنانچہ مزاج کی گرمی کے ساتھ انانیت اور خودی ورثہ میں ملی تھی۔ اس بنا پر انھوں نے ہر اس چیز سے بغاوت کی جس کو قبول کرنے کے لیے ان کا ذہن آمادہ نہ تھا۔ ان کی زندگی کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جوشؔ نے کبھی اپنے والد سے بغاوت کی تو کبھی گھریلو پابندیوں سے، کبھی سماج کے خلاف ہوئے تو کبھی مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا۔ گویا جوشؔ کی طبیعت میں مفاہمت کی گنجائش نہیں تھی۔ اسی منفرد ذہنیت اور طبیعت کے ساتھ جوشؔ نے قوم اور وطن سے بھی بالاتر ہو کر انسانوں کے مسائل پر توجہ دی۔ جوشؔ جس دور میں شعوری طور پر بے دار ہوئے وہ دور ہندوستانیوں کے لیے سخت کشمکش اور آزمائش کا دور تھا، جاگیر دارنہ نظام کا تسلط تھا، پورا ہندوستان آزادی کی آوازوں سے گونج رہا تھا، قابض حکومت سے نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم، سرمایہ دارانہ طاقتوں کے مظالم، کسانوں اور مزدوروں کی بے بسی، خشک سالی اور نظامِ

حکومت کی تباہ کاریاں ان تمام مسائل نے جوشؔ کی باغیانہ فطرت میں ہیجان پیدا کر دیا اور جب شاعری میں قدم رکھا تو اپنے گھن گرج والے انداز میں غم وغصے کا اظہار کیا چناں چہ جیسے جیسے جوشؔ کا فنی شعور آگے بڑھتا گیا اسی رفتار سے ان کی جدید شاعری میں وسعت بھی پیدا ہوتی گئی۔

جوشؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا لیکن کم عرصے میں ہی غزل کے بھی باغی ہو گئے۔ اس کی بھی وجہ یہی تھی کہ وہ جس سماجی زندگی کے انتشار اور انسانیت کی چیخ وپکار کو جس انداز سے پیش کرنا چاہتے تھے وہ غزل کے محدود دائرے میں ممکن نہیں تھا اس طرح جوشؔ نے ایک تاثراتی شاعر کے طور پر آگے قدم بڑھایا اور سیاست ومذہب سے لے کر عشق وخمریات تک، زندگی کے متعدد اور مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہر ایک موضوع کے لیے لہجہ بھی مختلف اپنایا۔ اس لیے وہ کہیں شاعرِ انقلاب نظر آتے ہیں تو کہیں وہ شاعرِ جمالیات اور کہیں زندگی کی حقیقتوں کا کھوج لگاتے نظر آتے ہیں تو کہیں مذہبی موضوعات پر شاعری کرتے نظر آتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر ان کی انقلابی شاعری زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ یہ بھی ان کی باغیانہ فطرت کا نتیجہ ہے جس میں بغاوت انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جوشؔ کے انقلاب میں انگریزوں کے دور کی نسبت آزادی کے بعد کے دور میں تعمیری پہلو زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ اس دور کی نظموں میں وہ انداز وہ ولولہ اور تپش نظر نہیں آتی جو جوش وخروش آزادی سے پہلے کی نظموں میں تھا۔ یہ انداز بھی جوشؔ کا معاشرے سے ہم آہنگ ہونے کا نتیجہ ہے۔ ''ماتمِ آزادی'' جیسی نظموں میں جو مایوسی محسوس ہوتی ہے یہ بھی جوشؔ کی اس فطرت کی عکاس ہے۔ مزید یہ کہ جوشؔ محض انقلابی کیفیات تک محدود نہیں ہیں بلکہ حسن وعشق اور فطری مناظر کی دل کشی کا اظہار بھی جوشؔ کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی شاعری میں فلسفیانہ گہرائی اور فکری بلندی بھی نظر آتی ہے وہ زندگی کے مسائل کو غور وفکر اور نظریاتی انداز میں دیکھتے ہیں۔ جوشؔ عمر بھر کائنات اور زندگی کا گہرا مشاہدہ اور چھپے ہوئے رازوں کی جستجو کرتے رہے ہیں اور جگہ جگہ اس کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں۔ غرضے کہ گزشتہ صدی میں جوشؔ نے جس انداز سے اور جس فکری پس منظر میں شاعری کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

جوشؔ کی فکری شاعری کی بنیادیں:

جوشؔ کے نظامِ فکر میں جو عناصر بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سب سے پہلا عنصر فکر کی آزادی ہے۔ جوشؔ آزادی فکر کو نظری اور عملی ہر دو صورتوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس حُرّیت فکر کا سب سے پہلا اظہار ان کی ان نظموں میں ہوتا ہے جو حبِ وطن اور انگریز دشمنی کے جذبات سے سرشار ہیں۔ جس کی عمدہ مثال ان کی نظم ''وطن'' ہے جو جوشؔ کی نوجوانی کے دور کی نظم ہے۔ جس میں وہ وطن سے وفاداری کا عہد کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی انداز کی

ان کی ایک اور نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' ہے۔ جس میں آزادی کی خواہش شدید تر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان نظموں کے علاوہ ''آثارِ انقلاب'' اور ''وفادارانِ ازلی کا پیغام'' جیسی دیگر متعدد نظمیں ہیں جن میں آزادی کی یہ خواہش اور آزادیٔ فکر کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ جوشؔ کے تصورِ حُرّیت میں غلامی سے نفرت اور وطن سے محبت شروع سے ہی جوشؔ کی بین الاقوامیت کا حصہ ہے۔ جوشؔ کے لیے وطن دوستی اور انسان دوستی دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں جوشؔ کے بقول:

> ''میں تمام نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں، وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے، انتہائی حقارت سے دیکھتا ہوں، لیکن اس قدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے۔''(۱)

جوشؔ سیاسی طور پر جس آزادیٔ فکر کے قائل ہیں جس کی وجہ سے جوشؔ ''شاعرِ انقلاب'' کہلائے، اس کا اظہار ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نثر میں بھی جابجا ہوتا ہے۔ جوشؔ فلسفی نہیں ہیں لیکن ان کے ہاں قدرے ایک منظم نظامِ فکر موجود ہے۔ جوشؔ کی شاعری کے بغور مطالعے سے باقاعدہ طور پر منظم تصورات اور نظریے مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ چاہے وہ جوشؔ کا تصورِ کائنات ہو، تصورِ انسان، ارتقائے انسانی اور سماجی ترقی سے متعلق ان کے عمرانی خیالات، طبقاتی تقسیم کی تنقید، ادب، تعلیم، اور عورت کا مقام وغیرہ ان تمام پر دیے گئے ان کے دلائل، یہ سب خیالات کسی باہمی تناقض کے بغیر منظم انداز میں نظر آتے ہیں۔ اس بنا پر جوشؔ اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد اسلوبِ فکر سامنے لانے میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

عقلیت پسندی:

جوشؔ کی فکر کا دوسرا اہم عنصر عقلیت پسندی ہے۔ وہ ہر معاملے میں عقل سے رہنمائی لیتے ہیں۔ عقل پر زور دینے کی روایت جس کی بنیاد سر سیدؔ احمد خان نے رکھی تھی اس خرد افروزی کی بنا پر جوشؔ منقولات کے منکر تو نہیں ہیں لیکن منقولات کو عقل کی میزان میں پرکھنے کے قائل ہیں۔ عقل کی ایک اعلیٰ سطح خالص تخیل بھی ہے لیکن دانشوری کا تعلق محض تخیل سے نہیں بلکہ تخیل کے ساتھ ساتھ تخلیقی آگہی سے بھی ہے کیوں کہ عمدہ تخیل تو عام روایتی شاعری میں بھی ہوتا ہے اور جوشؔ عقل کی اسی سطح کے ترجمان ہیں۔

عظمتِ انسان جوشؔ کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے، لیکن وہ انسانی عظمت کے فقط قصیدے نہیں سناتے بلکہ ان کی شاعری انسانی زندگی کے تمام تر پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے معاشرتی ناانصافیوں سے نبرد آزما بھی ہے۔ اور

نہ ہی وہ کسی مصلح کی طرح مسائل کے حل کے لیے محض مشورے دیتے ہیں بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کا مفکرانہ ذہن تقلید کی جاہلانہ روش سے انحراف کر کے عقل کو اپنا رہنما بنانے کا درس دینا چاہتے ہیں۔

اس دُھن میں کہ دل عقل کا شیدا ہو جائیں　　آفاق کے اسرار ہویدا ہو جائیں
مدت سے گرا رہا ہوں تخمِ افکار　　شاید کہ نئے درخت پیدا ہو جائیں(۲)

پوری دنیا ابتدا ہی سے کائنات، انسان اور خدا کے وجود کے حوالے سے حقیقت کا کھوج لگانے کے لیے مذہب، سائنس اور فلسفہ کی بنیادوں پر کوششیں کرتی آرہی ہے۔ جوشؔ کی شاعری میں انسان کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس لیے جوشؔ نے بھی اپنی شاعری میں ان موضوعات اور ان کی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انسان اور کائنات کی ان حقیقتوں کے پرکھنے کے سفر میں بیسویں صدی میں اقبالؔ اور جوشؔ دونوں آگے نظر آتے ہیں مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ اقبالؔ کے ہاتھ میں عشق کی شمع ہے جبکہ جوشؔ عقل کا پرچم بلند کیے دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں ہی نے انسان کی عظمت پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن دونوں کی فکر کے راستے الگ الگ ہیں اور جوشؔ، اقبالؔ کے برعکس ہر اس عقیدے اور نظریے کو تسلیم نہیں کرتے جو خلافِ عقل ہو گویا ہم کہ سکتے ہیں کہ خرد مندی ہی جوشؔ کا اصل دین ہے۔

جوشؔ اگرچہ بچپن سے ہی شدید جذباتی مزاج کے حامل تھے، لیکن ان کی یہ ایک منفرد صفت ہے کہ وہ منطقی حقائق کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی اس جذباتیت نے ان کی شاعری کے بعض موضوعات کو ایک الگ اور منفرد کیفیات سے ہمکنار کیا ہے، لیکن فکری مسائل میں عقل و جذبے کی آویزش شدید دکھائی دیتی ہے۔ جوشؔ نے جہاں مذہبی کتابیں، قرآن، انجیل، زبور، وید اور گیتا وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہاں مختلف سائنسی نظریات جیسے آئن سٹائنؔ کا نظریۂ اضافت اور ڈارونؔ کا نظریۂ ارتقا وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے، جبکہ فلسفیوں: سقراطؔ، ارسطوؔ، افلاطونؔ، مارکسؔ، نطشےؔ اور ہیومؔ وغیرہ کے افکار سے بھی آگاہ رہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ان فلسفیوں کے نظریات کو قبول بھی کیا ہے اور بعض اوقات رد بھی کیا ہے اور اپنی زندگی کے آخری دور تک ان فلسفیوں کو اپنے تنقیدی مطالعے میں رکھا اور جن فلسفیوں نے عقلی دلائل کو ہمیشہ اہمیت دی جوشؔ ان سے متاثر رہے۔ عقلیت کے راستے میں وہ تشکیک سے بھی ہمکنار ہوتے ہیں اور یہی تشکیک ان کے یہاں جستجو کے نئے در وا کرتی ہے۔ اور یہی تشکیک ان کے فلسفۂ حیات کی بنیاد بھی ہے اور یہی تشکیک ہی انھیں عقلیت کے راستے پر گامزن کرتی ہے۔

جوشؔ جس انسان کی عظمت کے قائل ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ وہ انسان ہر عمل میں معقولیت کو ہاتھ سے جانے نہ دے اور عقل کو اپنا رہنما بنائے۔ جوشؔ کی لاتعداد نظمیں ہیں جن میں عقلیت ہی خیال کا محور نظر آتی ہے۔ چاہے نظم کا موضوع کچھ بھی ہو یا خیال کی کسی بھی سمت سفر کرے عقل کی توانائی سے ہی اپنی فکر کا سفر طے کرتے ہیں۔ اس

ذہنی سفر میں ۱۲ بندوں پر مشتمل ان کی مشہور نظم "اے نوعِ بشر جاگ" بڑی اہمیت کی حامل نظم ہے۔

بند ملاحظہ کیجیے:

آفاق میں جو کچھ ہے وہ دانا کی نظر ہے　　وجدان نہیں، عقل جہاں سنج خضر ہے
دل، مرکزِ اندیشہ، نہ ملجائے خبر ہے　　انسان کی دولت ہے کوئی چیز تو سر ہے
اے نیند میں ڈوبے ہوئے انسان کے سر جاگ　　اے نوعِ بشر، نوعِ بشر، نوعِ بشر جاگ[۳]

عظمتِ انسان کا آفاقی پہلو:

کب سر پہ کسی نبی کا احسان لیا　　رازِ کونین، خود بخود، جان لیا
انسان کا عرفان ہوا جب حاصل　　اللہ کو، ایک آن میں، پہچان لیا[۴]

جوشؔ ملیح آبادی اپنی شاعری کے ذریعے کسی خاص گروہ یا مسلک کی نمائندگی نہیں کرتے، وہ کسی جغرافیائی حدود میں رہ کر یا فکر کے کسی خاص حصار میں رہ کر نہیں سوچتے بلکہ ان کی شاعری کا اہم موضوع انسان ہے اور انسانیت ان کا مسلک ہے۔ ان کے فکری سفر میں پوری انسانیت شریکِ سفر نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے سے فکر کے جو اجزا سامنے نظر آتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ: آزادی اور مسرت ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے اور اس راستے میں جتنی بھی رکاوٹیں آجائیں ختم کر دینا چاہیے۔ مذہب سے لے کر سیاست تک، اور عقائد سے لے کر سماجی بندھنوں کی تمام رائج الوقت اور توہّم پرستی پر مبنی تشریحات تک جو اس بنیادی حق کے حصول میں رکاوٹیں کھڑی کریں انھیں زندگی کے ہر شعبے میں آگے نہیں بڑھنے دیا جائے۔ ایسی فکر رکھنے والا انسان کسی ایک نظریے، کسی ایک شخصیت، کسی ایک راستے، کسی ایک تحریک یا کسی ایک مسلک پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ سکتا، اسی وجہ سے ان کی شاعری میں جابجا مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی عظیم شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔ اسی بنا پر جوشؔ کی فکر خیر و شر کے حوالے سے بھی نئے اصول سے روشناس کرواتی ہے جس میں عظمتِ انسان کا پہلو سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کے بقول:

> "جوشؔ کی شاعری کے فکری عناصر میں حبِ آدم اور عظمتِ انسان دو بڑے تصورات ہیں، خیر و شر کا تصور انھیں تصورات کا ایک حصہ ہے۔ ان تصورات کو انھوں نے جس طرح اپنی شاعری میں سجایا ہے اس کی مثال اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔[۵]

جوشؔ کی شاعری بنیادی طور پر مزاحمت اور انکار کی توانا آواز ہے، لیکن جہاں آفاقی انسانی رشتے اور عقل و

شعور ان کی شاعری کا موضوع بنتے ہیں تو ان کا لہجہ اقرار اور اثبات والا لہجہ بن جاتا ہے۔ گویا اقرار و انکار کے رستے پر گامزن ہوتے ہوئے صداقت کی تلاش جوشؔ کا مقصد ہوتا ہے۔ اور اس راستے سے وہ انسان دوستی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی انسان دوستی کی وجہ سے وہ اشتراکیت کے ہمنواؤں میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور اسی سبب وہ کارل مارکسؔ کو بھی بڑا مقام و مرتبہ دیتے ہیں۔

جوشؔ کے ادبی سرمایے پر محض سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوشؔ ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن کی فکر کا حاصل یہ ہے کہ انسان ابتدائے خلقت ہی سے آزاد پیدا ہوا تھا لیکن جب اس وسیع کائنات کی وسعتوں اور آرزوؤں اور تمناؤں میں دیکھا جائے تو ہر جگہ انسان جکڑا ہوا نظر آتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اس کائنات میں پابہ زنجیر کیسے ہوا۔ ان زنجیروں کو توڑ دینا چاہیے۔ جوشؔ اپنی شاعری کے ذریعے انھیں زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ جوشؔ کسی فرد یا ادارے کو یہ حق نہیں دینا چاہتے کہ وہ انسان کے سماجی، فکری، اقتصادی اور ثقافتی امور میں بے جا دخل اندازی کرلے۔ ان کی نظموں میں یہ عمومی رویہ نمایاں ہو کر نظر آتا ہے کہ زندگی کی سچائیوں اور آگہی کی مسافتوں میں جہاں جہاں رکاوٹیں حائل ہوں۔ انھیں ختم کرنے کی اُمنگیں جگاتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ گویا ان کی شاعری کی روح کی تلخیص انسان کا شرف اور افتخار ہے۔

جوشؔ کی شاعری کا انسان ہر تفریق اور ہر تقسیم سے بالاتر ہے وہ کسی خاص طبقے کا فرد یا کسی خاص علاقے کا مکین نہیں بلکہ آفاقی انسان ہے اور باشندۂ آفاق ہے:

انسان کی توحید کا مشتاق ہوں میں　　شمعِ حبِ عمیم کا طاق ہوں میں
مشرق کا نہ پابند نہ مغرب کا اسیر　　انسان ہوں باشندۂ آفاق ہوں میں

ہر سانس میں کوثر کے پیام آتے ہیں　　ہر گام پہ حوروں کے خیام آتے ہیں
بندوں سے جو اک بار ملتا ہوں گلے　　اللہ کے سو بار سلام آتے ہیں

جوشؔ اپنی شاعری کے ذریعے آج کے غافل انسان کو جھنجھوڑتے ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جو بذاتِ خود انسان کی عظمت کے ترانے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی مشہور نظم "انسان کا ترانہ" انتہائی اہمیت کی حامل ہے، جس میں اس انداز سے تراکیب استعمال کی گئی ہیں کہ یہ نظم عظمتِ انسان کے جدید منشور کا اہم حصہ قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی مشہور نظمیں: نور و ظلمت کی تفسیرِ نو، فکرِ غوّاص، دستِ گیتی شکن اور ذوقِ تسخیرِ قدرت جیسی لاتعداد نظمیں ہیں جو انسانی عظمت کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جوشؔ کے مرثیوں، موجد و مفکر اور عظمتِ انسان کے مطالعے سے بھی انسان کی ایک نئی تعبیر سامنے آتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کہنے کا حق وہی

شخص رکھ سکتا ہے، جس میں انسانیت کی اعلیٰ قدر بدرجہ اتم موجود ہو۔ وہ انسان کے اندر انسان نوازی کے اعلیٰ اقدار دیکھنے کی خواہش اس حد تک رکھتے ہیں کہ انھیں انسان دشمن کرداروں پر بھی رونا آتا ہے۔ انسانیت کا ایسا ہمہ گیر جذبہ جوشؔ کے علاوہ اُردو شاعری میں کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

جوشؔ کے سیاسی افکار:

جوشؔ کے سیاسی افکار کا اندازہ ان کے پہلے مجموعے سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ جب کہ اس دور میں جوشؔ شاعرِ انقلاب کے نام سے مشہور بھی نہیں تھے۔ جبکہ نثر سمیت انھوں نے اپنی پوری شاعری میں اپنے سیاسی نظریات کا برملا اظہار کیا ہے اور انھیں نظریات کے تحت وہ ہندوستانیوں کو بھی سامراج کے اس ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھانے کا پیغام دیتے نظر آتے ہیں۔ انسان دوستی اور، عظمتِ انسان جوشؔ کی فکر کی بنیاد ہیں۔ ان کے سیاسی افکار بھی اسی محور کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ جوشؔ اسی سیاست کے قائل ہیں جو انسان کی فلاح کی خاطر کسی فلاحی ریاست کے قیام کے لیے کی جائے۔ جوشؔ انسان کو ظلم و جبر سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے انھیں انسان پر انسان کا جبر اور انسانی طبقہ بندی بالکل بھی گوارا نہیں ہے۔ جوشؔ کی شاعری میں انسان کو معاشی اور معاشرتی ظلم کی چکی میں پیسے جانے والے سیاسی و معاشرتی نظام کے خاتمے کی شدید خواہش نظر آتی ہے۔

جوشؔ کے بقول سیاست کی دو قسمیں ہیں، ایک ظالم کی سیاست اور ایک مظلوم کی سیاست، ظالم کی سیاست کو جوشؔ علم سوز سیاست کہتے ہیں جبکہ مظلوم کی سیاست جو راکھ سے روشنی پیدا کرتی ہے۔ اور اسی سیاست کے جوشؔ حامی تھے۔ ان کے نزدیک منفی سیاست، جس کے ذریعے ظالم قوتیں طاقت کے بل بوتے پر انقلاب پسندوں کی کمر توڑ تو سکتی ہیں لیکن اپنے حضور جُھکا نہیں سکتیں۔ یہ وہ سیاست ہے جس نے ہر دور میں ذکاوت و دانش پر حملہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک ظالم حکومتوں کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا اور مصائب کا مقابلہ کرنا ہزار جہاد سے افضل ہے۔ جوشؔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے اور اشتراکی نظام کو ہی معتبر سمجھتے تھے اس لیے وہ سیاسی انقلابی تحریک کے ذریعے ہندوستانیوں پر جبری حکومت کرنے والے انگریز سامراج کا خاتمہ چاہتے تھے۔ جوشؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے فقط برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد نہیں کی بلکہ مسلمان حکمرانوں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ اس کی زندہ مثال کہ جب بات اصولوں پر آئی تو نظامِ حیدر آباد سے بھی ٹکرا گئے جس کے نتیجے میں انھیں ریاست بدر بھی ہونا پڑا جبکہ صدر ایوبؔ کے خلاف بھی نظم لکھی، نتیجتاً انھیں پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا یہاں تک کہ ان کا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا گیا۔

ہندوستان کی آزادی، سیاسی اور معاشرتی مسائل اور انگریز استعمار کے متعلق جس بے باکی کے ساتھ جوشؔ نے

لکھا ہے وہ کسی دوسرے شاعر نے نہیں لکھا۔ اس دور میں بہت کم ایسے شعرا ہیں جنھوں نے سیاسی آزادی کے لیے جوشؔ کی طرح جوش و خروش سے کام لیا ہو۔ جوشؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں کسی بھی سنگین سماجی مسئلے پر اپنا ردِ عمل کا اظہار کرنے میں کبھی تاخیر نہیں کی۔ ہندوستان کی معاشی بدحالی سے لے کر سماجی ناانصافیوں تک اور لسانی و فرقہ ورانہ تعصبات سے لے کر حکومتی جبر و تشدد تک جوشؔ نے تقریباً ہر موضوع پر خوب ردِ عمل دکھایا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم ہو یا جلیاں والا باغ کا ہولناک سانحہ، جوشؔ نے ہر سیاسی اتار چڑھاؤ پر بہت کھل کے لکھا ہے اور اسی طرح اپنے سیاسی نقطۂ نظر کو ہر خاص و عام تک پہنچایا ہے۔ جرأتِ اظہار کی یہ خصوصیت ان کی سیاسی شاعری میں جابجا نمایاں نظر آتی ہے۔

انسانیت کی فلاح و بہبود، انسانیت کا احترام جوشؔ کے سیاسی نقطۂ نظر کی بنیادیں ہیں۔ جوشؔ کی نظر میں سیاست اس رویے کا نام ہے جس کے ذریعے سے عام انسانوں کے مسائل کا سدِ باب ہو سکے اور ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکے جس میں تمام ہندوستانی اپنی مرضی سے آزادی اور حُرّیت کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر سکیں۔ جوشؔ احترام آدمیت کے علمبردار تھے جتنی محبت وہ اپنے جیسے انسان سے کرتے تھے انگریز سامراج کے لیے دل میں اتنی ہی نفرت بھی رکھتے تھے۔ اس کی وجہ نہ فقط انگریزوں کا ہندوستان پر ناجائز قبضہ تھا بلکہ ہندوستانیوں کو محکوم بنانے کے ساتھ ساتھ انگریز سرکار کی ظالمانہ عوام دشمن پالیسیاں، ہندوستانیوں کو انھیں کے مالی وسائل سے محروم رکھنا اور انھیں فقر و فاقے کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا بھی تھا۔ گویا انسان دوستی کے ساتھ ساتھ انگریز سے عداوت اور اس کے خلاف بغاوت جوشؔ کی سیاسی شاعری کی اساس تھی۔

جوشؔ کے سیاسی افکار کے حوالے سے یہ بات واضح ہے کہ انھیں انگریزوں سے حد درجہ نفرت تو تھی اور گاہے گاہے اپنی متعدد نظموں کے ذریعے اس کا اظہار بھی کیا ہے لیکن عملی سطح پر جوشؔ کا کوئی خاص سیاسی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے حسرتؔ موہانی اور ابوالکلام آزادؔ کی طرح جوشؔ نے کبھی جیل کی ہوا بھی نہیں کھائی۔ البتہ آزادی کے بعد پاکستانی سیاسی منظر میں جوشؔ کی سیاسی فکر کا ایک جداگانہ کینوس دیکھنے کو ملتا ہے۔ جوشؔ اور پاکستان کے تعلق کے حوالے سے سب سے اہم سیاسی نکتہ جوشؔ کا پاکستانی شہریت اختیار کرنا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں اقتدار کی جنگ اور عسکری حکومت کے سبب پیدا ہونے والے حالات و واقعات کا تجزیہ ہے۔ جوشؔ جب تک ہندوستان میں تھے نہرو جیسی شخصیات کی قربت نے ذاتی طور پر جوشؔ کو سیاسی فائدے پہنچائے لیکن پاکستان میں قدم رکھتے ہی پاکستان کی سیاست نے جوشؔ کو اس طرح گھیر لیا کہ وہ مرتے دم تک اس عذاب سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ اور پاکستانی شہریت کے حصول کا فیصلہ زندگی کی سب سے بڑی بھول ثابت ہوئی۔ جیسے ہی جوشؔ کے پاکستانی بننے کی خبر عام ہوئی پاکستانی ادیبوں اور صحافیوں سے لے کر سیاسی و مذہبی جماعتیں اور ان کے رہنما بھی ایک ہو کر

جوشؔ کے خلاف کمر بستہ ہوئے۔ جوشؔ عملی سطح پر سیاسی آدمی نہیں تھے اس لحاظ سے جوشؔ کی پاکستان آمد سے کسی سیاسی پارٹی کو مستقبل میں کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن پھر بھی جوشؔ سے پاکستان میں ہر سطح پر دشمنی برتی گئی۔ اس تمام صورت حال کے حوالے سے جوشؔ نے اپنی خود نوشت "یادوں کی برات" میں بھی ذکر کیا ہے۔ جوشؔ نے پاکستان کی عسکری حکومتوں کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا ہے ایوبؔ خان اور یحییٰؔ خان کی عوام دشمن پالیسیوں اور مارشل لا کے نام پر بے قصور عوام پر ظلم و زیادتی پر بھی لعن طعن کی ہے۔ بطورِ خاص ایوبؔ کی حکومت میں اپنے سیاسی افکار اور باغیانہ تیور کے باعث کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

جوشؔ کی انقلابی شاعری:

جوشؔ کی شاعری میں شروع ہی سے ایک احتجاجی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصفِ اول میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال جوشؔ کے احتجاجی لہجے کی موافق تھی۔ جوشؔ کا مزاج ایسا تھا کہ جہاں معاشرے میں کوئی خرابی، بے حسی، بے ضمیری اور انسان دشمنی جیسی کوئی خباثت سر اٹھانے لگتی اس کا ردِ عمل جوشؔ شعر کی صورت میں دکھاتے تھے۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کا درمیانی عرصہ بیسویں صدی میں آزادی کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل دور ہے۔ اس دور میں تحریکِ خلافت نہایت گرم جوشیوں کے ساتھ جاری و ساری تھی جبکہ ہندو مسلم اتحاد کا جوش و خروش بھی نمایاں تھا اور بیشتر سیاسی جماعتیں حصولِ آزادی کے لیے مستعد اور منزل کے حصول کے لیے ہم خیال ہو گئی تھیں۔ یہی وہ عہد ہے جس میں جوشؔ کی شاعری اپنی بلندیوں کی طرف جاتی نظر آتی ہے۔ اس وقت جوشؔ کی شاعری شدید جذباتی اضطراب کے اظہار کا ذریعہ بنتی جا رہی تھی۔ ان کی حسّاسیت کا یہ عالم تھا کہ صاحبانِ اقتدار کا کسی بھی قومی معاملے میں رخنہ ان کے قلم کو متحرک کرنے کے لیے کافی تھا۔ ظالم و جابر حکمرانوں کی بربریت ان کی فکر کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ انگریز سامرج کے ہولناک جرائم میں سے ایک جلیاں والا باغ کا واقعہ تھا جب جنرل ڈائرؔ کے حکم پر ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو عوامی جلسے پر گولیوں کی بوچھار کر دی گئی اور سینکڑوں کی تعداد میں معصوم لوگ قتل ہوئے تو ان کا قلم شعلے اگلنے لگا۔ اس واقعے کے بعد جوشؔ کی شاعری کا رنگ و روپ ہی کچھ اور ہو گیا۔ پھر انھوں نے متعدد ایسی نظمیں لکھیں جن میں انقلاب کی گونج سنائی دینے لگی۔ برطانوی دورِ اقتدار میں یہ آسان کام نہیں تھا کہ جوشؔ کی طرح باغیانہ اور انقلابی لہجے میں آزادی کی بات کی جائے۔ ۱۹۳۰ء سے پہلے تک ہی جوشؔ کے واضح اور دوٹوک نظریے کی جھلک ان کی نظموں میں دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ بات واضح رہے کہ اس وقت ترقی پسند تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ لیکن استعمار مخالف اہلِ قلم نے اس کی بنیادیں ہموار کر دی تھیں۔ سامراج کی غلامی میں پسے ہندوستانیوں کی رگوں میں زندگی کی رمق جن اہلِ قلم کی مرہونِ منت پیدا ہوئی ان میں جوشؔ کی لہو گرما دینے والی فکر

انگیز انقلابی نظموں کا کلیدی کردار ہے خصوصاً ان کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" نے سیاسی حلقوں میں ایک ہلچل سی پیدا کی۔ اس نظم سے انگریز حکمران اتنے خوفزدہ ہوئے کہ انھوں نے اس نظم پر پابندی عائد کی لیکن یہ نظم جنگل کی آگ کی طرح پورے ہندوستان میں پھیل گئی۳۸اشعار پر مشتمل یہ ولولہ انگیز نظم جوشؔ نے محض دس منٹ میں لکھ دی تھی۔ جوشؔ کی سیاسی نوعیت کی ایسی متعدد نظموں میں انقلابی اور احتجاجی رنگ نمایاں ہے۔

جوشؔ نے اپنی نظموں میں جہاں سامراجی نظام پر کُھل کر وار کیا ہے وہیں ان نظموں میں جوشؔ کے مجاہدانہ تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ کُھل گیا ہے اور شعلے برس رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی انقلابی نظموں میں فرنگیوں کو بے باک ہو کر کر للکارا ہے اور سامراجی نظام کے پارہ پارہ ہونے کی نوید سنائی ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کے سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں(۷)

تصورِ انقلاب:

بیسویں صدی کے برصغیر میں عام طور پر انقلاب کے دو تصورات تھے ایک تو یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کے ہر طبقے کو استعماری قوتوں کے ظلم و بربریت سے ہمیشہ کے لیے آزادی دلائی جائے اسی تصور نے آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے دل میں سرفروشی کا جذبہ مسلسل زندہ رکھا، جبکہ دوسرا تصورِ انقلاب اشتمالیت پسندوں کا تھا جو فقط حکومت کی تبدیلی ہی نہیں بلکہ پورے سماج کو بدل کر غیر طبقاتی معاشرے کی تشکیل کے خواہاں تھے۔ اگر ہم بیسویں صدی کے صفِ اول کے شعرا کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اقبالؔ، حسرتؔ اور فیضؔ سمیت دیگر اہم شعرا میں سے کوئی بھی انقلاب کا باقاعدہ کوئی تصور پیش نہیں کر سکا کیوں کہ شاعر اور سیاسیات کے ماہر میں فرق ہوتا ہے۔ جب ہم جوشؔ کی طرف دیکھتے ہیں تو چوں کہ جوشؔ بھی ماہرِ سیاسیات نہیں ان کے ہاں بھی انقلاب کا کوئی باضابطہ نظام تو نظر نہیں آتا لیکن یہ ضرور مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ جوشؔ اس عالمی طاقت کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتے ہیں کہ جس کی حکومت کا سورج دنیا میں غروب نہیں ہوتا اور یہ وہ حکومت ہے جس نے ہندوستان میں اپنا ناجائز قدم جمانے کے لیے خون کی ہولی کھیلی لہٰذا جوشؔ ہمہ وقت اس استعمار کے خلاف اپنے تُند لہجے میں برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کو عرفِ عام میں شاعرِ انقلاب کہا جاتا ہے، لیکن جوشؔ کے تصورِ انقلاب سے بعض ناقدین اتفاق نہیں کرتے۔ بعض نقادوں نے جوشؔ سے نظریاتی اختلافات کے سبب ان کے انقلابی خیالات کو رد کیا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ جوشؔ کے پاس انقلاب کا کوئی منظم فلسفیانہ تصور نہیں ہے، وہ صرف رومانوی تصورات کو انقلاب سمجھتے ہیں۔ لیکن کسی انقلابی ذہن کو اس انداز سے پرکھنا درست نہیں۔ غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ رومانوی مزاج ہی انقلابی مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ چناں چہ کسی شاعر کو شاعرِ انقلاب ان معنوں میں کہا جاتا ہے کہ جن نازک مسائل اور موضوعات کو دوسرے شعرا ہاتھ لگانے سے ڈرتے ہیں وہ انھیں بے باک ہو کر جرأت کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ اور جوشؔ نے یہی کیا ہے۔ جوشؔ کے انقلابی خیالات کو سمجھنے کے لیے ہمیں تقسیم سے پہلے کی عام زندگی اور اس دور کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی صورتحال کو سامنے رکھنا لازمی ہے۔ تقسیم سے پہلے انگریز حکومت کے ظالمانہ رویے۔ سماجی ناہمواریاں، معاشی مجبوریاں، عوام کا غم و غصہ، فرقہ واریت، فسادات، مذہب کے نام پر قتلِ عام جیسے غیر انسانی افعال کو سامنے رکھ کر ہی جوشؔ کے نظریات کو پرکھا جائے گا۔

اس منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے اور جوشؔ کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو جوشؔ کے اندر ظلم کے خلاف مزاحمت کا پہلو شروع سے ہی نظر آتا ہے ایسا لگتا ہے کہ ان ظالم طاقتوں کے خلاف ان کا پیدائشی جھگڑا ہے۔ اور ان قوتوں کے تسلط سے وہ آزاد ہونا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ جوشؔ زندگی کے ہر

شعبے میں انقلاب چاہتے ہیں۔ انقلاب کی ضرورت اور اہمیت کے حوالے سے جوشؔ کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

"زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب، آداب ورسوم میں انقلاب، نظریات ومعتقدات میں انقلاب، مسلمات وکلیات میں انقلاب، سیاسیات ومذہبیات میں انقلاب، یکسر انقلاب، تمام تر انقلاب اور مکمل انقلاب۔"(۸)

زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب چاہنے والے یہ شاعر جب انگریزوں اور ان کے آمرانہ اقتدار کے خلاف تند لہجے میں نظمیں لکھتے ہیں تو ان کا تصورِ انقلاب کسی مربوط آئینی جواز کا پابند رہنے کے بجائے کھُل کر ہندوستانیوں کے دل کی آواز بن جاتا ہے۔ جوشؔ جس دور میں انقلابی شاعری کر رہے تھے اس وقت ہندوستان کی سیاست میں انقلاب کا تصور نیا تھا۔ اس دور میں اصلاح پسندی اور آئین پرستی کا رجحان ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ جبکہ سیاست میں لبرل ازم اور جدیدیت کا بھی دور دورہ تھا ایسے حالات میں جوشؔ کے اس تصورِ انقلاب کی بعض جہات کو منفی اور تخریبی بھی سمجھا گیا اس لیے بعض ناقدین نے انھیں انقلاب کا مُغنّی کہنے سے احتراز بھی کیا ہے۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو جوشؔ انگریزوں سے آزادی چاہتے تھے، انھوں نے آزادی کے جو خواب دیکھے تھے انھیں حقیقت بنانے کے لیے اپنے راستے کی ہر دیوار کو مٹانا چاہتے تھے، اور اس کے لیے ان کی شاعری کو دھیمے لہجے کی بجائے جوشؔ وخروش درکار تھا سو انھوں نے اسی انداز اور لہجے کو اپناتے ہوئے ایسی شاہکار انقلابی نظمیں لکھیں کہ انگریزوں کے خلاف پیدا ہونے والے جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا۔

جوشؔ اُردو شاعری کی تاریخ کے وہ پہلے بے باک شاعر ہیں جنھوں نے مقتدر حلقوں کی موجودگی میں بغیر کسی خوف کے اپنی بے باک نظمیں اپنے مخصوص شعلہ بیاں انداز میں پڑھ کر مشاعرے کو جلسہ گاہ میں بدل دیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں جوشؔ کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ جوشؔ نے ہر مشاعرے میں بے خوف ہو کر انگریز سامراج کے خلاف نظمیں پڑھیں۔ ایسے مشاعروں کا احوال ہماری ادبی تاریخ میں موجود ہے۔ بطورِ مثال دوسری جنگ عظیم کے دوران میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کے بارے میں پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ نے لکھا ہے کہ:

"یہ مشاعرہ انگریزوں کی مدد کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔۔۔۔ یہ مشاعرہ امرتسر کے ایک سینما حال میں منعقد ہوا تھا۔ یہ مشاعرہ تھا تو جنگ کے مقاصد کی حمایت میں، لیکن جوشؔ نے اپنے کلام کی ابتدا اس قطعے سے کی:

سنو !اے ساکنانِ خاکِ پستی ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

اس قطعے پر سامعین کی کیا حالت ہوئی بیان کرنا مشکل ہے۔ مشاعرہ گاہ میں گویا قیامت آگئی۔۔۔۔۔۔ قطعہ کے بعد انھوں نے یہ نظم شروع کی تھی:

آج اگر راون کا گھر سیتا کا زنداں ہے تو کیا"(۹)

اسی طرح کے متعدد مشاعرے ہیں جن میں جوشؔ نے اپنے انقلابی تصور کو پورے آب و تاب کے ساتھ اپنے گھن گرج والے لہجے میں نظموں کے پیرایے میں پیش کیا ہے۔ اس وقت جوشؔ کی نظموں کا ایک سیل رواں جاری تھا جس میں انقلاب کی موجیں آزادی کا ایک نیا منظر نامہ لکھتی نظر آرہی تھیں۔ ان کی نظمیں: آثارِ انقلاب، صدائے بیداری، غلاموں سے خطاب، سرمایہ دار شہریار، وفاق، باغی انسان اور انسان کا ترانہ جیسی دیگر لاتعداد نظموں نے ذہنوں میں آزادی کی راہ ہموار کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔

نظموں کے علاوہ اس جذباتی آہنگ کے ساتھ قومی پس منظر میں نعت اور مرثیے لکھ کر وہ نعت کی محافل اور مرثیے کی مجالس کو بھی آزادی کی فضاؤں میں لے کر آگئے۔ محفلِ میلاد میں پڑھی جانے والی نظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

حق نے تم کو نوعِ انساں کا بنایا تھا امام　　بن گئے تم لعنتِ کوتاہ بینی سے غلام
جب یہ عالم ہے تو وابستہ رہو اصنام سے　　تم کو پھر کیا واسطہ پیغمبرِ اسلامؐ سے(۱۰)

جوشؔ کے تصورِ انقلاب میں ان کا مرثیہ "حسینؑ اور انقلاب" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مرثیہ ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا یہ وہ دور ہے جس میں ہندوستان میں سیاسی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ اس مرثیے نے سامعین کے دلوں کو نئے انداز سے گرما دیا۔ اس مرثیے میں جوشؔ نے انگریزوں کی جابرانہ تسلط اور آزادی کی جدوجہد کو تازہ کربلا کا نام دیا:

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار　　اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہر یار　　پھر کربلائے نو سے ہے نوع بشر دو چار
اے زندگی جلال شہ مشرقین دے　　اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسینؑ دے(۱۱)

گویا جوشؔ نے اپنی نظموں کے انقلابی آہنگ کی طرح مرثیے کی متعین روایت کو توڑ کر اس میں بھی انقلاب کی روح بھر دی۔

جوشؔ کی گھن گرج والی نظموں کے دور میں ان کے تصورِ انقلاب کو رومانی کہا جارہا تھا۔ اسی اثنا میں جب ان کا مرثیہ بھی انقلاب کا رنگ لیے سامنے آیا تو ان کے انقلابی تصور پر ایک نئے پیرایے میں بحث ہونے لگی اور مختلف اہلِ قلم نے جوشؔ کے تصورِ انقلاب پر الگ الگ انداز اور معیار پر بحث کی خود ترقی پسند حلقہ ذہنی طور پر جوشؔ سے قریب تر ہونے کے باوجود دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس تحریک سے وابستہ اکثر ناقدین مارکسی نظریات کے حامل تھے ان کے

نزدیک مارکسی سیاسی فلسفہ کے تحت پیدا ہونے والا انقلاب ہی صحیح معنوں میں انقلاب کہلایا جاسکتا تھا۔ انھیں بنیادوں پر مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیضؔ نے اشتراکی نقطۂ نظر سے جوشؔ کے انقلابی تصور کو پرکھا اور جوشؔ کو شاعرِ انقلاب تسلیم کرنے میں تامّل سے کام لیا۔ جبکہ فیضؔ کے نقطۂ نگاہ کے برعکس سردار جعفریؔ نے فیضؔ کے کافی بعد ۱۹۹۳ء میں لکھا کہ ''۱۹۴۳ء کے آس پاس جوشؔ کے عروج کے زمانے میں کچھ شعرا اور ناقدین نے کہا کہ جوشؔ کا تصورِ انقلاب رومانی ہے وہ شاعرِ انقلاب نہیں شاعرِ شباب اور شاعرِ شراب ہے اس کے بعد یہ بات اتنی بار دہرائی گئی کہ یقین کا درجہ اختیار کر گئی''[۱۲] حالانکہ جوشؔ کی کلی شاعری میں انقلاب کے واضح تصورات ابھرتے ہیں۔ خلیق انجمؔ کے نزدیک جوشؔ کے تصور انقلاب کو رومانی قرار دینا بے مقصد تنقید کا نتیجہ ہے۔[۱۳]

سیاسی اور انقلابی ادب تخلیق کرنے والے شعرا کی شاعری کا تجزیہ سیاسی رہنماؤں کے افکار کی بنیادوں پر نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ سیاستدانوں اور رہنماؤں کے افکار پر بحث ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے جن میں سیاسی قاعدے، آئینی نکات اور ملک کے اقتصادی امور کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے جبکہ سیاسی اور انقلابی نظمیں لکھنے والے کسی شاعر کو ان ضوابط کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا جب ہم جوشؔ کی شاعری کو اس انداز سے پرکھتے ہیں تو جوشؔ کے یہاں معاشرتی ناہمواریوں سے مسلسل پیکار نظر آتا ہے اور جاگیر دارنہ ذہنیت کے زیر نگیں معاشرے میں انقلاب دوستی کے ان گنت اور نئے رنگ ایک آزاد زندگی کی انفاس کی صورت میں محسوس ہوتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ جوشؔ کا تصورِ انقلاب سمجھنے کے لیے اس دور کے ہندوستان کے ساتھ ساتھ جوشؔ کے ہم عصر شعرا کو بھی پڑھنا ہوگا تب جاکے جوشؔ کی شاعری کی اصل روح تک پہنچ سکتے ہیں۔ جوشؔ کی انقلابی شاعری محض انقلاب یا آزادی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ ان کے بڑے تصورات کا چھوٹا حصہ ہے اس لیے کہ وہ فقط شاعرِ انقلاب ہی نہیں وہ شاعرِ انسان اور شاعرِ کائنات ہیں اور انسان کی عظمت، آزادی اور مسرت ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں:

جوشؔ کے مذہبی افکار:

اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کیے جاتا ہے[۱۴]

کسی بھی شاعر کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی کو ایک ہی زاویے سے دیکھنے کے بجائے اس کی حیات کے مختلف رویوں اور زاویوں کو پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں جوشؔ جیسی رنگارنگ شخصیت کے افکار سمجھنے کے لیے ان کی زندگی کے تمام گوشوں کا غیر جانبدارانہ طور پر اور کھلے ذہن و دماغ سے مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ کیوں کہ شخصیت کی پرکھ کے لیے فطری اور جذباتی تقاضوں کو بھی مدِ نظر رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

جوشؔ کے مذہبی کلام کے مطالعے سے ان کے مذہبی نظریات اور رجحانات سے بخوبی آگاہ ہوا جاسکتا ہے مگر نہ صرف عوام بلکہ ناقدین نے بھی ان کے مذہبی سرمایۂ کلام کو نظر انداز کیا ہے اور وہ محض ان کی خود نوشت "یادوں کی برات" میں درج معاشقوں کی کچھ کہانیوں کو بنیاد بنا کر ان کو منکرِ خدا اور اسلام دشمن قرار دینے پر مصر نظر آتے ہیں۔ جوشؔ کے حوالے سے ان کا یہ نظریہ شاید اس لیے ہے کہ جوشؔ نے غیر عقلی عقائد، مذہبی رسومات، اساطیر، اوہام پرستی، حکایات و روایات وغیرہ کی کھل کر اور دوٹوک الفاظ میں مخالفت اور مذمت کی ہے۔ اور قوم کو ذہنی پسماندگی سے نکال کر عقل پرستی کی طرف لے جانے کی کوشش کی ہے۔ "یادوں کی برات" میں "میرا دین" کے عنوان کے ذیل میں جوشؔ نے اپنے مذہبی نظریات کے متعلق لکھا ہے کہ:

> "جو اب تک مجھے مومن سمجھتے رہے ہیں وہ اپنے حسنِ ظن سے توبہ کرلیں کہ میرا دین خیابانِ ذہنِ انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصولِ علم و فقدانِ جہل کی آرزو اور محرکِ اولین کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔"(۱۵)

اس اقتباس سے جوشؔ کے بڑے اور کشادہ ذہن، صاف گوئی اور وسیع المشربی کا اندازہ ہوتا ہے۔ "یادوں کی برات" سے قطع نظر جوشؔ کا منظوم کلام اور افکار پڑھنے کے بعد یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ جوشؔ نے عقل پرستی کی تلقین کی ہے اور عقائد و رسومات کو عقل کی کسوٹی میں پرکھنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ کیجیے:

بوسیدہ روایات کی حرمت نہ کرو تحقیق و تجسس کی اہانت نہ کرو
دینِ آباء بھی تم کو لاحق ہوجائے ماں باپ سے اتنی بھی محبت نہ کرو(۱۶)

جوشؔ انسان دوستی کو اپنا مذہب اور ایمان سمجھتے ہیں۔ اور انسان کی محبت کو اللہ تک رسائی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ جوشؔ، مذہب کے ذریعے سے انسان کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ انسان کے ذریعے سے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رباعی ملاحظہ ہو:

کب سر پہ کسی نبی کا احسان لیا رازِ کونین خود بخود جان لیا
انسان کے عرفان ہوا جب حاصل اللہ کو اک آن میں پہچان لیا(۱۷)

جوشؔ انسان کو کسی مذہب، مسلک یا فرقے میں بٹنے کے بجائے فکری اعتبار سے ہر طرح کی بندشوں اور غلامی سے آزاد چاہتے ہیں۔ مذہب کے تمام تر غیر عقلی اور فرسودہ روایات اور طور و طریقوں کو رد کرتے ہیں۔

جوشؔ کے نزدیک کسی بھی حقیقت کو تحقیق کے بغیر ماننا جائز نہیں خواہ وہ دین و مذہب ہی کیوں نہ ہو، ان کے نزدیک وہ ایمان جس کی بنیاد تحقیق ہے اس ایمان سے معتبر ہے جس کی بنیاد تقلید و روایت ہے۔ جوشؔ تمام عمر خالقِ حقیقی کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ دراصل جوشؔ وجود خالقِ حقیقی کے منکر نہیں البتہ ملا کے خدا کو ماننے سے انکاری ضرور ہیں۔ جوشؔ نے اگر تشکیک سے کام لیا ہے تو وہ خدا کے حقیقی وجود کے حوالے سے نہیں بلکہ جوشؔ کی تشکیک کا

دائرہ روایتی مذہبی احکامات، اوہام پرستی اور اندھی تقلید وغیرہ تک ہی محدود ہے۔ یعنی وہ اسلام کو رسوم و روایات کی پابندیوں میں استوار دیکھنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے خدا کے شخصی تصور کی کھل کر مخالفت کی راغبؔ مراد آبادی کے بقول ''جوشؔ نے اس خدا کی مخالفت کی جسے سلاطین و بادشاہوں کی طرز پر تراشا گیا تھا۔''(۱۸)

جوشؔ نے اپنے کلام میں جگہ جگہ خدا کے اس شخصی تصور کی نفی کی ہے۔ رباعی ملاحظہ کیجیے:

ہندو نے اگر علم کا مندر چھوڑا　　مسلم نے بھی راستی کا منبر چھوڑا
پنڈت نے اگر بنا دیا بت کو خدا　　ملا نے خدا کو بت بنا کر چھوڑا(۱۹)

جوشؔ اس خدا کا منکر ہے جو انسان کی حقِ آزادی سلب کر لیتا ہے۔ جوشؔ ان مولویوں کی مذمت کرتے ہیں جو خدا کو کسی جابر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

یہ نارِ جہنم، یہ سزا، کچھ بھی نہیں　　یہ دغدغۂ روزِ جزا، کچھ بھی نہیں
اللہ کو قہار بتانے والو!　　اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں(۲۰)

خدا تعالیٰ کی ذات لا محدود ہے جب کہ انسانی عقل محدود ہے ایک لا محدود حقیقت ایک محدود شے میں کیسے سما سکتی ہے اس لیے جوشؔ کے مطابق انسانی عقل اللہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان کی حقیقت کو سمجھا جائے پھر اللہ تعالی کی معرفت حاصل کرنا ممکن ہو سکے گا۔

تجھے اس سے زیادہ کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا
خدا وہ ہے جو حدِ عقل میں آ ہی نہیں سکتا(۲۱)

جوشؔ نے اپنے جذبۂ حبِ انسانی کی بنیاد پر تمام بانیان مذاہب اور اہم تاریخی شخصیات جنھوں نے کسی نہ کسی طرح انسانوں کے اندر شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہیں سب کا بے حد احترام کیا ہے بالخصوص حضرتِ محمدؐ، حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ کے پرستار رہے ہیں۔ جوشؔ کی سرورِ کونین سے والہانہ مودت کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں انھوں نے اپنے کلام میں سرورِ کائناتؐ کی شان و عظمت کا جگہ جگہ بر ملا اظہار کیا ہے۔ جوشؔ کی مشہور نظم ''بحضورِ سرورِ کائنات'' کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اے کہ ترے جلال سے ہِل گئی بزم کافری　　رَعشۂ خوف بَن گیا رَقصِ بُتانِ آذری
خُشک عرب کی ریگ سے لَہر اُٹھی، نیاز کی　　قُلزمِ نازِ حُسن میں، اُف ری تری شناوری
اے کہ ترا غُبارِ راہ، تابشِ رُوئے ماہتاب　　اے کہ ترا نشان پا نازشِ مَہرِ خاوری
چھین لیں تُو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں　　ڈال دی تُو نے پیکرِ لات و ہُبل میں تھَرتھری(۲۲)

یہ نظم ۲۹ اشعار پر مشتمل ہے اس میں ایک منفرد والہانہ پن کا احساس ہوتا ہے۔

جوشؔ نے اپنی فکر کے اصولوں پر چلتے ہوئے جب انسان کے نجات دہندہ کی تلاش کی تو انھیں تاریخ میں امام حسینؑ جیسی ایک ایسی شخصیت نظر آئی جو اپنے اہل و عیال اور اصحاب و انصار کے ساتھ انسانیت کا پرچم بلند کرنے کے لیے ایک ظالم و جابر سلطان کے خلاف بر سارِ پیکار تھی۔ انھوں نے امام حسینؑ سے ظالم و جابر حکمرانوں اور ظلمت پسندوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا سبق سیکھا اور اپنے اثر انگیز کلام کے ذریعے اپنی قوم کے لوگوں کو امام حسینؑ کے لازوال تاریخی کردار کو اپنا رول ماڈل بنا کر ظلم کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

جوشؔ نے اپنی پہلی نظم، ''ہلالِ محرم'' ۱۹۱۳ء میں لکھی تھی اس وقت جوشؔ کی عمر پندرہ، سولہ سال تھی۔ اس نظم سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے لیے محرم کا مہینہ خصوصی توجہ کا لائق تھا۔ اس کے علاوہ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''روحِ ادب'' سے پہلے جس شعری تصنیف نے جوشؔ کو بطورِ شاعر متعارف کروایا تھا وہ بھی ان کا اولین مرثیہ ''آوازۂ حق'' ہی تھا۔

جوشؔ شیعہ اثنا عشری مسلک کو اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اختیار کر کے شبیر احمد خان، سے شبیر حسن خان جوشؔ ہوئے تھے اس لیے بہت سے قلم کاروں نے جوشؔ کے حوالے سے اپنی شدید قسم کے تحفظات کا اظہار بھی کیا ہے۔ مگر جوشؔ نے اپنی فکر، رنگارنگ طبیعت اور کسی حد تک مسلکی عقیدت بالخصوص امام حسینؑ سے والہانہ عقیدت کی بنا پر مرثیے لکھتے رہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کی ابتدا کلاسیکل انداز میں ہوئی تھی ''آوازۂ حق'' میں کلاسیکل مرثیے کے تمام اجزا موجود ہیں۔ اس میں کلاسیکل مرثیے کے اجزا کے ساتھ آخر میں قوم کی پست حالی کے خاتمے کے لیے حضرت امام حسین سے امداد کی درخواست بھی کی ہے۔ لیکن اس کے بعد ''حسین اور انقلاب'' میں کلاسیکل مرثیے کے اجزا سے روگردانی کرتے ہوئے جوشؔ جدید مرثیے کے بانیوں میں شمار ہوگئے۔

مجموعی طور پر بیسویں صدی جہاں عالمی تناظر میں بڑی اہمیت کی حامل صدی ہے وہاں بر صغیرِ پاک و ہند کی سیاسی، اقتصادی، ادبی اور فکری صورتحال کے نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ اس صدی کی سیاسی اور فکری صورتحال نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا وہاں اس دور کے ادبی منظر نامے کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا، اور اس صدی میں علامہ اقبالؔ اور فیض احمد فیض جیسے اردو کے دیگر بہت سے بڑے شعرا سمیت جوشؔ ملیح آبادی جیسے مفکر شاعر بھی اس صورتحال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انھوں نے اپنی بلند آہنگ شاعری اور اپنے آفاقی افکار کے ذریعے سے بیسویں صدی کے انقلاب پسند اور روشن خیال ذہنوں اور بیسویں صدی کے ہندوستان کی نئی نسلوں کو فکری اور سیاسی اعتبار سے اپنی منزل متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اور جوش ملیح آبادی نے اپنی بلند آہنگ شاعری اور متنوع افکار کے ذریعے سے نہ صرف بیسوں صدی کے لوگوں کو متاثر کرتے رہے بلکہ آج اکیسویں صدی مین بھی عقلیت پسند اور روشن فکر لوگ ان کی شاعری اور افکار سے رہنمائی لیتے ہیں۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد، تخلیقاتِ جوشؔ کی فکری بنیادیں، مشمولہ روزنامہ جنگ، شمارہ ۱۵ جنوری ۲۰۲۴، ملاحظہ کیجیے: https://jang.com.pk/news/1053980

۲۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۸۹

۳۔ ایضاً، ص ۹۲-۹۳

۴۔ اقبال حیدر، نادیدنی یوں جوشؔ، (کراچی: الفاظ فاونڈیشن، ۲۰۱۷ء)، ص ۳۷

۵۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن، ص ۸۴

۶۔ ایضاً، ص ۸۶-۸۷

۷۔ گوپی چند نارنگ، شاعر حُرّیت و فطرت- جوش ملیح آبادی، مشمولہ دوماہی الفاظ، شمارہ نمبر ۴، ۵، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۲ء، ص ۴۵

۸۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن، ص ۶۸

۹۔ ایضاً، ص ۶۹-۷۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۱-۷۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۲-۷۵

۱۳۔ سید جعفر عسکری، جوش ملیح آبادی کی سیاسی شاعری: برصغیر میں تحریکِ آزادی پر اثرات کا عمرانی مطالعہ، (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی شعبۂ عمرانیات، جامعہ کراچی، ۲۰۲۲ء، ص ۵۹

۱۴۔ محمد عرفان، جوش ملیح آبادی: لفظیات و نفسیاتی رجحانات، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰۶

۱۵۔ جوشؔ ملیح آبادی، یادوں کی برات، (کراچی: جوشؔ اکیڈمی، ۱۹۷۰ء)، ص ۳۲۲

۱۶۔ سید جعفر عسکری، جوش ملیح آبادی کی سیاسی شاعری: برصغیر میں تحریکِ آزادی پر اثرات کا عمرانی مطالعہ، ص ۴۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۱، ۴۲

۱۸۔ راغب مراد آبادی، ہمارے جوش صاحب، مرتبہ: خورشید علی خان، (کراچی: ذیشان کتاب گھر، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۵

۱۹۔ ڈاکٹر یحییٰ احمد، جوش ملیح آبادی، شخصیت، افکار اور زبان و بیان، (لاہور: نیازمانہ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۰

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ سید جعفر عسکری، جوش ملیح آبادی کی سیاسی شاعری: برصغیر میں تحریکِ آزادی پر اثرات کا عمرانی مطالعہ، ص ۴۸

۲۲۔ ڈاکٹر سید فضل امام رضوی، جوش کا عقیدۂ مذہب، مشمولہ جوش ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ، مرتبہ قمر رئیس، (ناشر و سنہِ اشاعت ندارد)

مآخذ

۱۔ احمد، یحییٰ، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت، افکار اور زبان و بیان، لاہور: نیازمانہ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۲۔ حیدر، اقبال، نادیدنی ہوں جوشؔ، کراچی: الفاظ فاونڈیشن، ۲۰۱۷ء

۳۔ رضوی، سید فضل امام، ڈاکٹر، جوش کا عقیدۂ مذہب، مشمولہ جوش ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ، مرتبہ قمر رئیس، ناشر و سنہِ اشاعت ندارد

۴۔ عرفان، محمد، جوش ملیح آبادی: لفظیات و نفسیاتی رجحانات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء

۵۔ مراد آبادی، راغبؔ، ہمارے جوش صاحب، مرتبہ: خورشید علی خان، کراچی: ذیشان کتاب گھر، ۱۹۹۶ء

۶۔ ملیح آبادی، جوشؔ، یادوں کی برات، کراچی: جوشؔ اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

۷۔ نقوی، ہلال، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء

رسائل و اخبارات:

۱۔ دوماہی الفاظ، شمارہ نمبر ۴، ۵، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۲ء

۲۔ روزنامہ جنگ، شمارہ ۱۵ جنوری ۲۰۲۴ء،

غیر مطبوعہ

۱۔ عسکری، سید جعفر، جوش ملیح آبادی کی سیاسی شاعری: برصغیر میں تحریکِ آزادی پر اثرات کا عمرانی مطالعہ، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی شعبۂ عمرانیات، جامعہ کراچی، ۲۰۲۲ء

Refrences:

1. Dr. Syed Jafar Ahamad, *Takhliqat-e-Josh ki Fikri Bunyadain* in Daily *Jang*, 15th January, 2024, https://jang.com.pk/news/1053980
2. Dr. Hilal Naqvi, *Josh Malihabadi: Shakhsiyat aurr Fan*, (Islamabad: Pakistan Academy of Letters, 2007), p. 89
3. Ibid, p. 92-93
4. Iqbal Haidar, *Nadeedni hunn Josh*, (Karachi: Alfaz Foundation, 2017), p. 73
5. Dr. Hilal Naqvi, *Josh Malihabadi: Shakhsiyat aurr Fan*, p. 84
6. Ibid, p. 86-87
7. Gopi chand Narang, *Sha'ir-e-Hurriyat-o-Fitrat: Josh Malihabadi* in bi-monthly Alfaz, No. 4 & 5 (July to October, 1982), p. 45
8. Dr. Hilal Naqvi, *Josh Malihabadi: Shakhsiyat aurr Fan*, p. 68
9. Ibid, p. 69-70
10. Ibid, p. 71
11. Ibid, p. 71-72
12. Ibid, p. 72-75

13. Syed Jafar Askari, *Josh Malihabadi ki Siyasi Shairi: Barr-e-Sagheer main Tehreek-e-Azadi par Asrat ka Umarani Mutala,* (Unpublished research thesis for PhD, Department of Sociology, University of Karachi, 2022), p. 59
14. Muhammad Irfan, *Josh Malihabadi: Lafziat-o-Nafsiyati, Rujahanat*, (Dehli: Educational Publishing House, 2009), p. 106
15. Josh Malihabadi, *Yadon ki Barat*, (Karachi: Josh Academy, 1970), p. 322
16. Syed Jafar Askari, *Josh Malihabadi ki Siyasi Shairi: Barr-e-Sagheer main Tehreek-e-Azadi par Asrat ka Umarani Mutala*, p. 40
17. Ibid, p. 41, 42
18. Raghib Muradabadi, *Hamarey Josh Sahib*, Edited by Khursheed Ali Khan, (Karachi: Zeeshan Kitab Ghar, 1996), p. 35
19. Dr. Yahya Ahmed, *Josh Malihabadi: Shakhsiyat, Afkar or Zaban-o-Bayan*, (Lahore: Naya Zamana Publication, 2009), p. 30
20. Ibid
21. Syed Jafar Askari, *Josh Malihabadi ki Siyasi Shairi: Barr-e-Sagheer main Tehreek-e-Azadi par Asrat ka Umarani Mutala*, p. 48
22. Dr. Syed Fazl Imam Rizvi, *Josh ka Aqeeda-o-Mazhab* in Josh Malihabadi ka Khususi Mutala, Edited by Qamar Raees (Publisher and date not mentioned)

Bibliography:

1. Ahmed, Yahya, Dr., *Josh Malihabadi: Shakhsiyat, Afkar or Zaban-o-Bayan*, Lahore: Naya Zamana Publication, 2009
2. Haidar, Iqbal, *Nadeedni hunn Josh*, Karachi: Alfaz Foundation, 2017
3. Irfan, Muhammad, *Josh Malihabadi: Lafziat-o-Nafsiyati, Rujahanat*, Dehli: Educational Publishing House, 2009
4. Malihabadi, Josh, *Yadon ki Barat*, Karachi: Josh Academy, 1970
5. Muradabadi, Raghib, *Hamarey Josh Sahib*, Edited by Khursheed Ali Khan, Karachi: Zeeshan Kitab Ghar, 1996
6. Naqvi, Hilal, Dr., *Josh Malihabadi: Shakhsiyat aurr Fan*, Islamabad: Pakistan Academy of Letters, 2007
7. Rizvi, Syed Fazl Imam, Dr., *Josh ka Aqeeda-o-Mazhab* in Josh Malihabadi ka Khususi Mutala, Edited by Qamar Raees, Publisher and date not mentioned

Journals and Newspaper

1. Daily *Jang*, 15th January, 2024
2. Bi-monthly *Alfaz*, No. 4 & 5 July to October, 1982

Unpublished work

1. Syed Jafar Askari, *Josh Malihabadi ki Siyasi Shairi: Barr-e-Sagheer main Tehreek-e-Azadi par Asrat ka Umarani Mutala,* Unpublished research thesis for PhD, Department of Sociology, University of Karachi, 2022